فکر و نظر............ اسلام آباد   جلد: ۴۷   شمارہ: ۳

وجودیت، تصورِ موت اور اسلامی تناظر

ڈاکٹر خواجہ محمد سعید☆

Abstract

According to existentialists, it is important that human beings be aware of death. They do not take the death negatively but hold that knowledge of death is fundamental human condition that gives meaning to living. The apprehension of death and the apprehension of life are correlated. The fear of death looms over those who are afraid to participate fully in life. They believe that people who fear death also fear life, it is as if one is saying "I fear death because I have never fully lived." According to existentialists death is of two types: Subjective death and objective death. In view of existentialists subjective death is more important because it is related to the imagination of a human being. In Islamic teachings proper conception of death is also given vital importance for a successful fulfilment of life. This article attempts to present an analysis of existentialist point of view about death in Islamic perspective.

☆☆☆☆☆

وجودیت کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جب ہم جذباتی کیفیات کی روشنی میں انسانی وجود کے معنی دریافت کرنے کے لیے فلسفیانہ کوشش کرتے ہیں تو اس کا نام وجودیت ہے۔ وجودیت ایک فکری تحریک ہے اور اس فکر میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وجودیت میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ مذہبی وجودیت کے حامی خدا کے وجود کو مانتے ہیں جبکہ غیر مذہبی وجودیت کے حامی خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ مذہبی وجودیت کے حامیوں میں کرکیگارڈ، مارسل، بوبر، اور جیسپر شامل ہیں جبکہ غیر مذہبی وجودیت کے حامیوں میں ہائیڈیگر، سارتر، کامیو، ڈی بوائر کے نام سرفہرست ہیں۔ وجودیت دراصل انسان کا ایک ایسا طرزِفکر ہے جس میں عقل، ذہن تصور یا خیال کے بجائے انسان کے جذباتی پہلو کے حوالے سے بحث شامل ہے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کیوں کہ وجودی فکر میں انسان ہی سب کچھ ہے اور فکر اس کے اردگر چکر لگاتی ہے۔ اسی فکر کے ذریعے انسان اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ تاریخ فلسفہ یونان میں سقراط پہلا فلاسفر ہے جس نے اخلاقی اقدار کی بات کی، یوں اس نے فلسفہ وجودیت کی بنیاد رکھی کیوں کہ اخلاقی اقدار کا تعلق انسان کے ساتھ ہے چنانچہ سقراط یونان کا پہلا وجودی فلاسفر تھا۔ سقراط کے بعد سورن کرکیگارڈ نے پہلی بار اس تحریک کو تقویت دی۔ بعد میں بہت سے فلاسفہ اس تحریک کو لے کر چلے ان فلاسفہ میں سب سے نمایاں فلسفی ژاں پال سارتر ہے۔ جب بھی وجودیت کا نام لیا جاتا ہے تو سارتر کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے یوں سارتر اور وجودیت ایک ہی تحریک کے دو نام ہیں۔ وجودیت میں وجود اور جوہر کے فرق کی بحث شامل ہے عموماً وجود کو جوہر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کو سادہ زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا کہ انسان کا موجود ہونا اس کا وجود ہے جب کہ انسان میں پائی جانے والی خصوصیات اس کا جوہر ہے۔ مثلاً ''میں انسان ہوں'' اور ''انسانیت'' کا جوہر رکھتا ہوں۔ جب انسان اپنے خارجی ماحول سے مایوس ہوتا ہے تو وہ اپنی داخلی کیفیت کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے وجود کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے یہاں پہنچ کر وہ وجودیت کا سہارا لیتا ہے پھر اسے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ خارجی طور پر تباہ ہو گیا ہے تو داخلی طور پر ابھی زندہ ہے۔ انسان کی موت دو طرح سے ہے ایک معروضی (Objective) اور دوسری موضوعی (Subjective)۔ جب انسان گھن، تشویش یا تنہائی کا شکار ہوتا ہے تو یہ اس کی معروضی (Objective) موت ہے۔ انسان اپنے آپ کو بے یار و مدگار محسوس کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے اسے اس دنیا میں پھینک دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ:

> ﴿**قال اهبطوا بعضكم لبعضٍ عدو ولكم في الارض مستقر و متاع الىٰ حين. قال فيها تحيون و فيها تموتون و منها تخرجون**﴾ (۱)
>
> ''اللہ نے فرمایا تم سب بہشت سے اُتر جاؤ۔ اب سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لئے ایک وقت خاص تک زمین پر ٹھکانا اور زندگی کا سامان کر دیا گیا ہے۔ یعنی کہا کہ اُسی میں تمھارا جینا ہوگا اور اسی میں مرنا اور اسی میں سے قیامت کو زندہ کر کے نکالے جاؤ گے''۔

یہی معروضی موت انسان کو داخلی طور پر بھی کمزور کرتی ہے جو موضوعی (Subjective) موت کا سبب بنتی ہے۔ لیکن اگر انسان داخلی طور پر مضبوط ہو تو وہ معروضی موت سے بھی چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ جب ہمارے جذبات، احساسات اور تخیلات معروضی موت سے آزاد ہوں تو انسان داخلی طور پر

جبر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہائیڈیگر کے نزدیک انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی موت کا سامنا ہوتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے موت کا خوف اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ لیکن وہ طبعی موت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وجودیت میں خوف منفی معنی میں لیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں خوف مثبت معنی میں لیا جاتا ہے جس میں اللہ کا خوف ہوتا ہے وہ ہمیشہ اچھے افعال سرانجام دیتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کا خوف رکھتے ہیں وہ اس مال میں سے جو اللہ نے ان کو عطا کیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔ انسان کی کچھ موضوعی یا داخلی کیفیات ہیں جو اسے اس دنیا میں اس کے وجود کے ہونے کا احساس دلاتی ہیں ان میں دہشت، بوریت، مایوسی، موت، کراہت، جرم وغیرہ ہیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک دہشت ہے جو انسان کے اندر عدم وجود یا فنائیت کا تصور ابھارتی ہے۔ یوں انسان کے گرد نیستی کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ نیستی کے تصور کے ساتھ وجودیت میں موت کا تصور بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ موت ایک ایسی موضوعی کیفیت ہے جو کسی بھی معروضیت میں ضم نہیں ہو سکتی کوئی بھی انسان کسی دوسرے کی موت نہیں مر سکتا ہر ایک نے اپنی موت مرنا ہے۔ یوں انسان ہر لمحے موت کے امکان کی طرف محو رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وجودیت میں انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ذہنی اور عقلی کے بجائے جذباتی پہلو کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کرکیگارڈ کے خیال میں موت مستقبل میں پیش آنے والا کوئی خارجی واقعہ نہیں بلکہ اس کا تعلق انسان کی داخلیت سے ہے اس کا کوئی مقررہ وقت نہیں یہ کسی بھی وقت آ سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان مرنے سے پہلے اپنے تمام فیصلوں کو عملی جامعہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول اسد اللہ خان غالب:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

....

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

(میر تقی میر)

ہائیڈیگر کے نزدیک انسان ''وجودبرائے موت'' ہے۔ موت ایک اٹل امکان ہے لیکن سارتر کے خیال میں موت انسان کا امکان نہیں بلکہ اس کے امکانات سے باہر ہے البتہ موت انسان کی دشمن ہے لیکن بحالت شعور اُسے شکست نہیں دے سکتی۔ اس کے برعکس جیسپرز کے نزدیک موت ایک شخصی

واقعہ ہے نہ دوست نہ دشمن ہے۔

شوپنہار نے کہا تھا کہ ''موت کی حقیقت کا ادراک کیے بنا فلسفیانہ قیاس آرائی امر محال ہے''۔ اس کے اس قول میں موت کے فلسفیانہ تصور کا اظہار ہوتا ہے۔ سقراط نے بہت پہلے اس حقیقت کو بیان کر دیا تھا بعد میں رواقیوں (Stocis) نے اس تصور کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کرکیگارڈ، جاسپرز، اور ہائیڈیگر نے موت کے تصور کو ایک نئے انداز سے پیش کیا۔ ہائیڈیگر کے نزدیک جب تک وجود موجود کا وجود ہے اس وقت تک اس کی تکمیل نہیں ہوتی لیکن جب اس کی تکمیل ہوتی ہے تو وہ اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ عام طور پر موت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہے لیکن حقیقت ایسی نہیں جس طرح ہم کسی سفر پر جاتے ہیں اور اپنی منزل پر پہنچ کر کہتے ہیں کہ راستہ ختم ہو گیا حالاں کہ وہ راستہ اگلی منزل کے لئے جاری رہتا ہے۔ ختم ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی عمل یا شے ناقابل تکمیل ہو۔ مثلاً کوئی بھی منصوبہ تکمیل کی صورت میں اختتام پذیر ہو سکتا ہے لیکن ہم اس کے بارے میں مکمل یا نامکمل کے طور پر جانچ سکتے ہیں۔

موت کیا ہے؟ اس کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایک ایسا خارجی واقعہ ہے جو زندگی سے ہمارا رشتہ توڑ دیتی ہے۔ ہماری زندگی پر اس کے کوئی مثبت اثرات نہیں ہوتے البتہ خوف کی صورت میں اس کے منفی اثرات ضرور ہوتے ہیں۔ غالب نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

....

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے مرنا نہیں چاہتا بلکہ اس دن سے ڈرتا ہے جب موت آئے گی لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب زندگی کی تکالیف بڑھ جاتی ہیں تو انسان خود موت کے لیے دعا بھی مانگتا ہے بسا اوقات انسان خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ خودکشی میں انسان خود موت کو گلے لگاتا ہے۔ بیماری کی صورت میں بعض اوقات ایسی کیفیات بھی آ جاتی ہیں کہ نہ صرف بیمار بلکہ اس کے قریبی رشتہ دار بھی اس کی موت کے لئے دعا کرتے ہیں مگر موت نہیں آتی اسی لئے غالب

نے کہا تھا کہ:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

منحصر مرنے پر ہو جس کی اُمید　　نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

اسی طرح Euthanasia جس کو آسان موت کہا جاتا ہے مذہبی اور اخلاقی حلقوں میں ایک بڑا مسئلہ زیر بحث ہے۔ سیکولر دنیا میں بھی اس کے حق اور مخالفت میں آراء پائی جاتی ہیں۔ اسلامی ممالک میں Merciful Killing کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ خود قرآن پاک نے ایسی موت کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ولا تلقوا بایدیکم الی التّھلکة﴾(۲)

''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''

﴿من قتل نفسا بغیر نفس او فسادٍ فی الارض فکأنّما قتل الناس جمیعا﴾(۳)

''جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اُس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا''

ان آیات کے علاوہ دوسری قسم کی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿فاذا جآء اجلھم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون﴾(۴)

''جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں''

﴿وما کان لنفسٍ ان تموت إلاّ باذن الله کتٰباً مؤجلا﴾(۵)

''اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے اُس نے موت کا وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے''

زندگی کیا ہے؟ اور موت کیا ہے؟ چکبست نے اس کی تشریح اس طرح کہ ہے:

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترتیب

موت کیا ہے؟ ان ہی اجزا کا پریشان ہونا

یعنی موت کے بعد انسان انہی اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے جن کے ملنے سے بنا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد خُدا وندی ہے:

﴿ولقد خلقنا الانسان من سللٰة مّن طين﴾(۲)

''اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا''

گوشت کا لوتھڑا خاکی ہے اور خاک بن جاتا ہے۔ یہ بات ان الفاظ کے ہیر پھیر سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً گوشت کو عربی میں''لحم'' کہتے ہیں اگر اس لفظ کو الٹا پڑھا جائے تو یہ محل بن جاتا ہے۔محل کو فارسی زبان میں''کاخ''کہتے ہیں اگر کاخ کو الٹا پڑھا جائے تو یہ خاک بن جاتا ہے۔

اس آیت میں خلاصہ سے مراد مٹی کے اجزاء ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانی جسم میں پائے جانے والے سارے ہی اجزاء زمینی اجزاء ہیں ہمارا جسم خلیوں کے ملاپ سے بنتا ہے اور جسم کے خلیوں میں ان عناصر کا تناسب عمومی طور پر زمین میں پائے جانے والے عناصر کے تناسب کے مقابلہ میں مندرجہ ذیل ہے:

عناصر	عام خلیے میں تناسب(فی صدی)	زمین میں تناسب(فی صدی)
۱۔ ہائیڈروجن	۰ء ۴۹	۰ء۲۲
۲۔ کاربن	۰ء۲۵	۰ء۱۹
۳۔آکسیجن	۰ء ۲۵	۰ء ۴۷
۴۔ نائٹروجن	۰ء۲۷	۰ء۱
۵۔کیلشم	۰ء۰۷۳	۳ء۵
۶۔پوٹاشیم	۰ء۰۴۶	۲ء۵
۷۔سلیکون	۰ء۰۳۳	۲۸ء۰
۸۔میگنیشم	۰ء۰۳۱	۲ء۲
۹۔ فاسفورس	۰ء۰۳۰	۰ء۱
۱۰۔سوڈیم	۰ء۰۱۵	۲ء۵
دیگر عناصر	برائے نام	۱۳ء۷

اس کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے اگر پانی کو ٹسٹ ٹیوب میں ڈال کر اس میں

تھوڑا سا تیزاب ملا کر اس سے بجلی کا کرنٹ گزرا جائے تو پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تحلیل ہو جاتا ہے اسی طرح موت کے بعد انسانی جسم انہی اجزاء میں تحلیل ہو جاتا ہے جن سے مل کر بنا تھا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ زندگی عناصر اربعہ میں ترتیب کا نام ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ کائنات کی تمام اشیاء چار عنا صر آگ، پانی، مٹی اور ہوا کے ملاپ سے وجود میں آئیں۔ تھیلیز جس کو فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے اس کے بارے میں ہمیں ارسطو کی مابعد الطبیعیات میں معلومات ملتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کائنات ایک کل ہے تو اس کی علت کیا ہے؟ ارسطو کا کہنا ہے اس کے خیال میں اس کائنات کی علت پانی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پانی تمام اشیاء کا جزو ہے اس کے برعکس انیکسیمنڈر کا خیال تھا کہ کائنات کی علت مادہ ہے مگر وہ پانی نہیں اس کے خیال میں کائنات کی تخلیق لا محدود مادہ سے ہوئی ہے۔ اسی طرح انکسیمنز کا کہنا تھا کہ اس کائنات کی اصل ہوا ہے۔ ایمپیڈوکلس (Empedocles) کا کہنا ہے کہ یہ چاروں عناصر کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب ان عناصر میں انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ یہ انتشار ایک خارجی واقعہ ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے، حال سے نہیں اس کا تعلق دوسروں سے ہے مجھ سے نہیں یہ ایک معروضی موت کا تصور ہے لیکن وجودیت کے نزدیک یہ ایک غیر حقیقی اور غیر انسانی تصور ہے۔ وجودیت کے نزدیک موت کا حقیقی تصور یہ ہے کہ یہ ہمہ وقت موجود داخلیت کی حیثیت رکھتی ہے جو ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اس سے قبل کے وجودی فلاسفہ کے موت کے بارے میں نظریات کا جائزہ لیا جائے اس سے پہلے مسلمان فلاسفر ابن مسکویہ کے موت کے بارے میں نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس طرح موت کا تصور زیادہ بہتر طور پر واضح ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ موت دنیوی زندگی کا اختتام اور ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر موت ایک ابدی زندگی کا آغاز ہے تو لوگ اس سے ڈرتے کیوں ہیں؟ ابن مسکویہ اس کا جواب اپنی کتاب 'تهذيب الاخلاق و تطهير الاعراق' میں دیا ہے کہ وہ کون کونسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے انسان موت سے ڈرتا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو اس کی حقیقت سے واقف نہیں یا پھر وہ موت کو ایک ایسا تجربہ خیال کرتے ہیں جو بہت تکلیف دہ ہے اس کے علاوہ وہ آخرت کی سزا سے ڈرتے ہیں یا اپنے اہل عیال کو چھوڑنے کا افسوس ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دولت مند ہوتے ہیں اور انہیں اپنی دولت کو چھوڑنے کا خوف ہوتا ہے۔ یہ جتنے بھی خوف ہیں اس کا اصل سبب ہماری جہالت ہے اور جہالت کا واحد حل علم ہے۔

موت کی اصل ماہیت کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جب روح مادی جسم سے اپنا

رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو اس کے بعد جسم اجزاء میں تحلیل ہو جاتا ہے جس کو ہم عام زبان میں جسم کا فنا ہونا کہتے ہیں۔ اب روح جسم کو اپنے مسکن کے طور پر استعمال نہیں کر سکتی۔ لیکن جسم کی فنا میں روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ روح ایک غیر فانی جوہر ہے یعنی روح کو بقائے دوام حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کو موت نہیں آتی مثلاً اگر ایک شخص مرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں زندگی کو موت آ جاتی زندگی دوسرے اجسام میں جاری و ساری رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی روح سے روح حضرت آدم علیہ السلام میں پھونکی یعنی زندگی کی لہر خود اللہ تعالیٰ کے ذات سے چلتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿**اذ قال ربک للملٰئکة انی خالق بشرا من طین. فاذا سوّیته و نفخت فیه من روحی فقعُوْا له سٰجدینَ**﴾(۷)

ترجمہ: ''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ''

اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا یعنی زندگی رواں دواں رہے گی۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿**وتوکل علی الحیّ الّذی لایموت و سبح بحمده و کفی به بذنوب عباده خبیرا**﴾(۸)

''اور اس خدائے زندہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہ مرے گا اور اس کی تسبیح کرتے رہو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہے''

موت کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ روح کو جسم سے آزاد کر دیتی ہے اس طرح روح کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ انسان کے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ موت کا خوف دراصل انسان کے اپنے جوہر کی تکمیل کا خوف ہے جو عقلی طور پر درست نہیں۔ جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب روح جسم سے اپنا رشتہ منقطع کرتی ہے اور جسم فنا ہو جاتا ہے تو روح کہاں جاتی ہے؟ یہ خوف ہماری جہالت کا نتیجہ ہے جب ہم مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ خوف خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں موت کی تکلیف کا جو خوف ہے وہ بھی ایک خام خیال ہے جہاں تک آخرت میں سزا کا خوف ہے تو اپنے گناہوں کا خوف ہے جس کے اعمال اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق ہیں اس کو کوئی ایسا خوف نہیں ہوتا۔ اگر بُرے کام چھوڑ کر نیکی کی طرف رغبت اختیار کر لیں تو یہ خوف زائل ہو جاتا ہے۔ اہل و عیال کو چھوڑنے کا خوف بھی ایک فضول بات ہے۔ موت امر ربی ہے اس کے ساتھ مفاہمت ہی میں ہماری بہتری ہے اس طرح ہم بہتر طور پر دین اور

دنیا کے کاموں میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ دائمی زندگی کی خواہش بھی ایک فضول بات ہے اگر ہمیشہ کی زندگی ہوتی تو جو لوگ ہم سے پہلے اس دنیا میں آئے وہ نہ مرتے تو اس دنیا میں لطف اندوز ہونے کی ہماری باری کبھی نہ آتی۔ اسی طرح جو لوگ طویل عمر کی دعا مانگتے ہیں وہ دراصل بڑھاپے کی دعا کرتے ہیں اور بڑھاپا بذات خود ایک بڑا عذاب ہے۔ بنی پاکﷺ نے بڑھاپے کے بھولاوے سے پناہ مانگی ہے۔ ابن مسکویہ بھی وجودی فلاسفہ کی طرح موت کو ایک خارجی واقعہ ہی تصور کرتا ہے جس کا ادراک ہمیں خوف کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر ہم اس خوف کو عقل کے تابع کر دیں تو اچھے اعمال کا محرک ہو سکتا ہے۔ ابن مسکویہ ایک خدا پرست انسان تھا جبکہ کرکیگارڈ ایک عیسائی وجودی تھا لیکن اس کے نزدیک بھی موت ایک دوسری زندگی کا آغاز ہے لہٰذا اسی حوالے سے موت کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے نزدیک موت خارجی واقعہ نہیں بلکہ ایک داخلی جذبہ ہے ۔جذبے کے بغیر موت کے بارے میں سوچا بھی نہیں سکتا اس کے نزدیک جذبہ سے مراد خوف نہیں بلکہ عمل کا پر شوق فیصلہ ہے۔ اپنی کتاب Concluding Unscientific Postscript میں لکھتا ہے کہ جب مجھے موت آئے گی تو وہ کوئی عام شے نہ ہوگی بلکہ وہ میری اپنی موت ہوگی۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں کسی وقت بھی آ سکتی ہے یعنی اس کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے انسان اس بات سے آگاہ نہیں کہ موت کب اور کہاں آنی ہے تو یہ بات کسی حد تک وہی ہے جو اسلام کا تصور موت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ان الله عنده علم الساعة و ینزّل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ما ذا تکسب غدا. وما تدری نفس بأی ارضٍ تموت ان الله علیم خبیر﴾(۹)

''اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی حاملہ کے پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے کہ نر یا مادہ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کس سر زمین میں اُسے موت آئے گی بے شک اللہ ہی جاننے والا اور خبردار ہے''

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو موت و حیات کے بارے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام میں زندگی حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس میں پہلا مرحلہ ماں کے پیٹ میں ہے یعنی مادر رحم دوسرا مرحلہ دنیوی زندگی کا ہے اور تیسرا مرحلہ ابدی زندگی ہے جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے لیکن اس کے لئے دنیوی زندگی بڑی اہم ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو مادر رحم کو ہی اپنی کل کائنات سمجھتا ہے اگر اس کو دنیا کے بارے میں بتایا جائے کہ اس کائنات سے ایک دن کوچ کر کے

وہ دنیا کی زندگی میں چلا جائے گا تو شاید وہ اس کا یقین نہ کرے اسی طرح جب اس دنیا سے ایک دن کوچ کرکے ابدی زندگی میں چلا جانا ہے۔ اسلام کے نزدیک دوسرے مرحلے سے ابدی زندگی میں منتقل ہونے کا نام موت ہے۔ مسلمان فقہائے کرام نے موت کی تعریف یہ کی ہے کہ:

﴿الموت جسر بین حیاتین، حیاۃ الدنیا الفانیۃ، و حیاۃ الاخرۃ الخالدہ﴾

''موت ایک پل ہے جو دو زندگیوں کے درمیان واقع ہے، اس دنیا کی فانی زندگی اور آخرت کی ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی''۔

فقہاء کی اس تعریف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ موت ایک طریق کار ہے جس کے ذریعے انسان زندگی کے دوسرے مرحلہ سے ابدی زندگی میں داخل ہوتا ہے بعض فقہاء کرام کے نزدیک روح کا جسم سے جدا ہو جانا موت ہے اور بعض کے نزدیک روح ایک لطیف جسم ہے جو انسانی بدن میں اس طرح حلول کرتی ہے جس طرح سبز لکڑی میں پانی حلول کرتا ہے۔ موت کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿اللہ یتوفّی الانفس حین موتھا و الّتی لم تمت فی منامھا فیمسک الّتی قضٰی علیھا الموت و یرسل الاخرٰی الیٰ اجل مسمیً ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون﴾(۱۰)

''اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقررہ تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں ان کے لئے اس میں نشانیاں ہیں''۔

اسلام میں زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ ایک بار جسم اور روح کے درمیان جب اتصال قائم ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کبھی فنا نہیں ہوتی۔ حکماء و اطباء نے روح کو تین اجزاء سے مرکب مانا ہے: نسیم جو عناصر کے لطیف بخارات سے کئی ہضم کے بعد پیدا ہوتی ہے اور غذا، نشو و نما اور ادراک کی قوتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس کو نسمہ، روح طبعی اور بدن ہوائی بھی کہتے ہیں۔ گوشت اور ہڈیوں میں اس کا سریان ایسا ہے جیسا کہ آگ کا لکڑی یا کوئلہ میں۔ اس روح ہوائی کو اسی جزو کی وجہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور جسم اس کی جدائی کی وجہ سے موت کا مزہ چکھتا ہے جس طرح کہ وہ خود بھی جسم کی جدائی کے باعث موت کی تکالیف اور رنج اٹھاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک جسم انسانی میں جب اس روح ہوائی کے پیدا ہونے کی استعداد نہیں رہتی تو وہ وہاں سے الگ ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام موت ہے نہ کہ روح ہوائی سے روح حقیقی کا الگ ہونا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ:

''اس لطیف بخار کا اصل مرکز دل، دماغ اور جگر ہے۔ خون کے جوش سے یہ قلب میں پیدا ہوتا اور طب کی تدبیر کا تصرف اس میں جاری ہوتا ہے۔ دوسرا جزو نفس ناطقہ ہے جو بالخصوص اور اس کے علاوہ جو بھی نفوس ہیں وہ سب عموماً نفس کلیہ کے بلبلے ہیں۔ صاحبان کشف و وجدان نے معلوم کیا ہے کہ عالم میں ایک نفس ہے جو کل موجودات کا مدبر ہے۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی نفس کا مقتضی ہے۔ اس کو طبیعت کلیہ اور وہ نظام جو اس نفس کا مقتضی ہے اسے مصلحت کلیہ کہتے ہیں جو ایک وضع اور ہیئت سے پوشیدہ ہے اور دوسری وضع سے ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرا جزو روح ملکوت ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس کلیہ کی بعض قوتیں (مستقبل میں ہونے والی چیزوں کی) صورتوں کو ان کے ہونے سے قبل اٹھاتی ہیں جس طرح انسان کسی کام کی صورت کو اپنے ذہن میں اس کام کے ظاہر ہونے سے قبل اٹھاتا ہے۔ روح ملکوت کی خاصیت یہ ہے کہ روح القدوس کے سامنے جو خطیرۃ القدس میں حاضر ہو اور اس سے اتصال پیدا کرے اور روح افلاک سے اسرار و رموز اس کے دل پر فائض ہوں۔ اجزاء درحقیقت اسی جزو کا اپنی خاصیت سے خطیرۃ القدس کی طرف انجذاب ہے۔

نسمہ میں بھی ایک سر اور مقررہ خاص حد ہے جس سے تجاوز نہیں ہو سکتا۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اس نسمہ کی ایک دوسری صورت پیدا ہوتی ہے اور روح حقیقی کی وجہ سے اس کی حس مشترک میں سے جو کچھ باقی تھا اس میں ایک ایسی طاقت پیدا ہوتی جو عالم امثال کی مدد سے قوت گویائی و شنوائی اور بینائی کا کام دیتی ہے۔ یعنی اس کو ایسی قوت مل جاتی ہے جو محسوسات و مجردات کے درمیان ہوتی ہے۔ عالم مثال کے ذریعہ اس میں لباس نورانی یا ظلماتی کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے عالم برزخ کے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی نسمہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بہت سے ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا نسمہ ان کے ساتھ موت ظاہری کے بعد بھی رہتا ہے۔ اسی بنا پر ان کے اجسام زمین کے اندر جوں کے توں رہتے ہیں اور مٹی ان کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتی''(۱۱)

شاہ ولی اللہ وجودیوں کی طرح خارجی موت کے قائل تھے۔ انسان کے اندر دو طرح کی روح پائی جاتی ہے ایک حیوانی روح جو موت کے وقت انسان کے جسم سے الگ ہو جاتی ہے جب کہ انسانی روح ظاہری موت کے بعد بھی جسم کے ساتھ تعلق قائم رکھتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج

اپنی شعاعوں سے زمین کو حرارت دیتا ہے ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون﴾(۱۲)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ لیکن تم نہیں جانتے''

روح کی مختلف اقسام ہیں جن میں نباتی، حیوانی، انسانی، روح القدوس اور روح الٰہی ہے۔ انسان میں دو طرح کی روح پائی جاتی ہے ایک حیوانی روح جو موت کے وقت جسم سے رابطہ منقطع کر دیتی ہے دوسری انسانی روح جو ظاہری موت کے بعد بھی جسم کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھتی ہے اس کی مثال بلور میں فیض آفتاب کی سی ہے۔ جسم انسانی اکمل موجودات ہے یہ روح حیوانی سے نشو ونما پاتا ہے یہ جسم مکمل آئینہ کی مانند ہے اور روح انسانی مثل آفتاب ہے۔ اگر آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو بھی آفتاب کا فیض باقی رہتا ہے جس طرح آئینہ ٹوٹ کر ٹکڑوں میں بکھر جاتا ہے اسی طرح انسانی جسم اپنے اجزاء میں بکھر جاتا ہے۔ جب روح یا نفس اس مادی جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو وہ اس دنیا کے لوگوں کی نظر میں مر جاتا ہے مگر عالم ارواح کی دنیا میں اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں نفس کی موت کا ذکر ہے ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿کل نفس ذآئِقة الموت﴾(۱۳)''ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے''

نفس سے مراد انسانی توانائی ہے یا وہ قوت ہے جس سے تمیز کی صلاحیت شعور اور ارادہ و احساس کی قوت پیدا ہوتی ہے نیز اسے عقل، علم اور قلب انسانی کے معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ شعوری قوت بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نیند اور موت کی صورت میں موقوف کر دیتا ہے۔ نفس انسانی میں دو طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جس طرح خارجی احوال کے بارے میں علم آنکھوں، کانوں اور دماغ کے ذریعے ہوتا ہے اسی طرح نفس انسانی اپنی خواہشات کو دماغ کے ذریعے جسم طبیعی کے ہاتھوں اور زبان تک پہنچاتا ہے اور اس طرح اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ نفس کی دوسری خصوصیات کا اظہار خوابوں کی دنیا میں ہوتا ہے جہاں نفس انسانی روح کے ساتھ ملکر اپنا وجود ظاہر کرتا ہے اور بغیر مادی حواس کے اپنا کام کرتا ہے۔ عالم خواب میں روح انسانی بغیر مادی آنکھوں کے دیکھتی ہے بغیر مادی کانوں کے سنتی ہے بغیر جسمانی اعضاء کے حرکت کرتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفس کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں نفس کے تین مراتب بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد ربانی کہ:

۱۔ نفس امارہ:

﴿وما ابرئُ نفسی ان النفس لأمّارة بالسوء الا ما رحم ربی ان ربی غفور رحیم﴾(۱۴)

''اور میں اپنے تئیں پاک صاف نہیں کہتا کیوں کہ نفس امارہ انسان کو برائی سکھاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے''

۲۔ نفس لوامہ: قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لا اقسم بیوم القیٰمة. ولا اقسم بالنفس اللوّامة﴾(۱۵)

''ہم کو روزِ قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے''

نبی پاکﷺ نے نفس لوامہ کی وضاحت یوں فرمائی کہ:

''عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَليهِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً صِرَاطًا مُستَقِيمًا وَ عَلَى جَنْبَتَيْ الصِّرَاطِ سُورَانِ فِيهِمَا أَبْوَابٌ مُفتّحَةٌ وَ عَلَى الْأَبْوَابِ سُتُورٌ مُرْخَاةٌ وَ عَلَى بَابِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُولُ أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا الصِّرَاطَ جَمِيعًا وَلَا تَتَفَرَّجُوا وَدَاعٍ يَدْعُو مِنْ جَوْفِ الصِّرَاطِ فَإِذَا أَرَادَ يَفْتَحُ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَإِنَّكَ إِن تَفْتَحْهُ تَلجهُ وَالصِّرَاطُ الْإِسْلَامُ وَالسُّورَ انِ حُدُودُ اللّٰه تَعَالى وَالأبوابُ الْمُفتحَةُ مَحَارِمُ اللّٰهِ تَعَالَى وَ ذَالكَ الدَّاعِي عَلَى رَأسِ الصِّرَاطِ كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالدَّاعِي فَوْقَ الصِّرَاطِ وَاعِظُ اللّٰهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ''(۱۶)

''اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کا تذکرہ فرمایا اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک سیدھا راستہ ہوجس کی دونوں طرف دیواریں ہوں اور ان میں جابجا دروازے ہوں، جن پر پردے آویزاں ہوں اور سر راہ ایک نقیب پکار رہا ہو کہ دیکھ بھال کر چلنا اور ادھر اُدھر نہ مڑنا۔ اس کے آگے دوسرا نقیب ہے جس کا کام یہ ہے کہ اگر کوئی دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ چلّا اٹھتا ہے کہ ارے بد نصیب اسے نہ کھولنا، اگر تو اس کو کھولے گا تو اس کے اندر چلا جائے گا۔ (پھر نبی پاکﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا) ''صراط'' اسلام ہے۔ اور ''دو دیواریں'' اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں اور ''کھلے ہوئے دروازے'' اللہ تعالیٰ کے محارم ہیں۔ پہلا نقیب قرآن پاک اور دوسرا مومن کانفس لوامہ ہے۔

۳۔ نفس مطمئنہ: قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿یآیّتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة. فادخلی فی عبٰدی .

وادخلی جنتی﴾(۱۷)
''اے اطمینان پانے والی روح اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی''۔

وجودیوں کا معروضی (objective) موت کا تصور اسلام کے تصور موت کے قریب تر ہے۔ ایک انسان اگر پچاس سال عمر پاتا ہے تو پانچ دفعہ خارجی طور پر مر جاتا ہے کیونکہ اس کی ظاہری شکل میں تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی ملازمت کے حصول یا شناختی کارڈ کے لئے درخواست دیتے ہیں تو ہم سے موجودہ فوٹو گراف مانگے جاتے ہیں کیونکہ ہماری ظاہری ہیئت بدل جاتی ہے۔ سائنس کی زبان میں اس کو phenotype کہتے ہیں فلسفے کی زبان میں ہم جس کو داخلیت کہتے ہیں سائنس کی زبان میں اسے Genotype کہتے ہیں۔ وجودیوں میں کرکیگارڈ کے نزدیک داخلیت انسان کی سب سے بڑی قدر ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ انسان جب داخلی طور پر اپنی موت کے امکان کے بارے میں سوچتا ہے اتنا ہی تیزی سے اس کی داخلیت ترقی کرتی ہے یعنی موت کا شعور دعوت عمل ہے کرکیگارڈ کا نظریہ بلکہ وہی ہے جو اسلام کا ہے کیونکہ قرآن میں جہاں بھی موت کا ذکر ہے وہ صرف اس حوالے سے ہے کہ انسان اس دارالعمل یعنی دنیا میں اپنے آپ کو نیک اعمال کی طرف راغب کرے اور اپنے من کو پاک کرے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿الذی خلق الموت و الحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا و ھو العزیز الغفور﴾(۱۸)
''اُسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ زبردست بخشنے والا ہے''

﴿یایھا الذّین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتنّ الا و انتم مسلمون﴾(۱۹)
''مومنو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا''

اسد اللہ خان غالب اگرچہ وجودی نہیں تھے لیکن انھوں نے وجودیوں سے بھی بڑھ کر بات کی ہے۔ ان کے نزدیک بھی موت تازیانہ عمل ہے لیکن وہ کرکیگارڈ کی طرح جذبے کو نہیں بلکہ تخیل کو اہمیت دیتے تھے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ان کا خیال تھا زندگی کا سارا رنگ اور رونق موت کے ساتھ ہے۔ موت کے ذریعے ہی انسان نشاط کار کی لذت سے آشنا ہوتا ہے اگر موت نہ ہوتی تو انسان کا ذوق عمل ماند پڑجاتا۔ انسان میں

کوشش اور جد و جہد کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ مسکویہ نے موت کے بارے میں جس عقلی اور علمیاتی پہلو پر بات کی اس کے برعکس کرکیگارڈ موت کے جذباتی اور وجودیاتی پہلو کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ موت کوئی بے جان تصور نہیں بلکہ ایک بھرپور جذبہ ہے۔ تقریباً تمام وجودیت پسندوں نے موت کا انسانی تصور پیش کیا لیکن ہائیڈیگر پہلا مفکر ہے جس نے موت کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ اپنی کتاب ''وجود اور زمانہ'' (Being and Time) میں لکھتا ہے کہ داخلی اعتبار سے انسان فکر کا دوسرا نام ہے یعنی انسان ''وجود برائے فکر'' (Being-for-Care) ہے اس کا یہ جملہ مابعد الطبیعیاتی ہے۔ اس کے نزدیک موت بھی ایک فکر ہے۔ عموماً ہم فکر کو تشویش کے معنی میں لیتے ہیں لیکن ہائیڈیگر کے نزدیک فکر کا تعلق انسان کی داخلیت سے ہے۔ قرآن پاک بھی فکر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تدبر وتفکر قرآن کا سب سے اہم موضوع ہے۔ تدبر وتفکر کا تعلق انسان کی داخلی کیفیت سے ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستة ایام ثم استوٰی علٰی العرش یدبر الامر ما من شفیع الا من بعد اذنه ذٰلکم اللہ ربکم فاعبدوہ افلا تذکرون﴾(۲۰)

''تمھارا پروردگار تو اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش تخت شاہی پر قائم ہوا وہی ہر ایک کا انتظام کرتا ہے۔ کوئی اس کے پاس اس کا اذن حاصل کئے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے تو اسی کی عبادت کرو۔ بھلا تم غور کیوں نہیں کرتے''۔

﴿الذین یذکرون اللہ قیاماً وّ قعودا وّ علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحٰنک فقنا عذاب النار﴾(۲۱)

''جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے تو قیامت کے دن ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو''۔

﴿ثم کلی من کل الثمرٰت فاسلکی سبل ربک ذللا. یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانه فیه شفآء للناس ان فی ذلک لاٰیة لقوم یتفکرون﴾(۲۲)

''اور ہر قسم کے میوے کھا اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چلی جا۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے کئی امراض کی شفا ہے۔ بیشک سوچنے والوں کے لئے اس میں بھی نشانی ہے''۔

﴿یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھمآ اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما و یسئلونک ما ذا ینفقون. قل العفو کذٰلک یبین اللہ لکم الأیت لعلکم تتفکرون﴾(۲۳)

''اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کون سا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لئے اپنے احکام کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تا کہ تم سوچو''

﴿لو انزلنا ھذا القراٰن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعا من خشیۃ اللہ و تلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون﴾(۲۴)

''اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور کریں''

﴿اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضٰی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الی اجل مّسمّی. ان فی ذٰلک لأیت لقوم یتفکرون﴾(۲۵)

''اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت اُن کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقررہ تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں اُن کے لئے اس میں نشانیاں ہیں''۔

اسی طرح دوسری بہت سی آیات ہیں جن میں تدبر وتفکر پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ۷۵۶ آیات ایسی ہیں جن میں مظاہر فطرت کے مطالعہ اور ان پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ وجودیت پسندوں کے نزدیک انسان تنہائی میں داخلیت کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل کا فیصلہ کرتا ہے اور اس میں نئی ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کا یہ نظریہ اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ نبی پاکؐ اپنی بچپن کی زندگی میں صحرا میں بکریاں چَراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے خاص بندے کو نبوت کے لئے چن لیتا ہے تو نبوت پر فائز ہونے سے پہلے اس ماحول میں جس میں اس نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو عام کرنا ہوتا اس کی پوری طرح تربیت کرتا ہے۔ جب اس کی تربیت مکمل ہو جاتی ہے تب اس پر اپنی وحی نازل فرماتا ہے۔ صحرا ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں کوئی دوسری شئے انسان کے ذہن میں خلل پیدا نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی پاکﷺ صحرا میں بکریاں چراتے تھے اور اس دوران پوری طرح غورو فکر کرتے تھے۔ اسی طرح جوانی میں نبوت سے پہلے غار حرا میں جاتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مظاہر فطرت پر غور و فکر کے بعد حقیقت مطلقہ تک رسائی حاصل کی۔ ارشادِ ربانی ہے کہ:

﴿فلما جنّ علیه الیل راٰکوکبا قال هذا ربی فلمآ افل قال لآ احب الاٰفلین .فلما راَ القمر بازغا قال هذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضآلین .فلما راَ الشمس بازغة قال هذا ربی هذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بریٓ ء مما تشرکون. انی وجّهتُ وجهی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وّ ما انا من المشرکین .وحآجه قومه قال اتحآجونی فی الله و قد هدٰئن ولا اخاف ما تشرکون به الا ان یشآء ربی شیئًا وسع ربی کل شیءٍ علما افلا تتذکرون﴾ (۲۶)

''اور ہم اس طرح ابراہیم کو آسمان اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے تاکہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہو جائیں۔ یعنی جب رات نے ان کو ڈھانپ لیا تو آسمان میں ایک ستارہ نظر پڑا کہنے لگے یہ میرا پرودگار ہے جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔ پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اٹھے کہ میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ نہیں دکھائے گا تو میں ان لوگوں میں ہو جاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے یہ سب سے بڑا ہے مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے لوگو جن چیزوں کو تم اللہ کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تیئں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں''۔

ڈیکارت نے کہا تھا کہ:

''میں سوچتا ہوں اس لیے میں موجود ہوں'' (Cogito Ergo Sum)

ڈیکارٹ کا تصور فکر دراصل اپنی ہستی کا علم ہے یعنی ''میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں'' ایک ایسا فکری عمل ہے جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

''اب اگر مجھے اپنے ہونے کا یقین ہے تو یہ یقین ایک ذی شعور ہستی کی حیثیت سے ہے۔ اس میں جسمانی پہلو کی اہمیت نہیں۔ اپنے جسمانی پہلو کے بارے میں، میں غلطی کا شکار ہو سکتا ہوں۔ تاہم اپنے ذی شعور ہستی ہونے کے بارے میں علم

> براہ راست اور یقینی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''میں کیا ہوں''؟ میں ایک ایسی شئے ہوں جو سوچتی ہے یعنی ایک ایسی شئے ہوں جو شک کرتی ہے، سمجھتی ہے، ادراک کرتی ہے، اثبات یا ابطال کرتی ہے، ارادہ کرتی ہے، محسوس کرتی ہے...... وغیرہ ایک شئے جو ان تمام صفات سے متصف ہو...... روح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ روح ایک ایسا جوہر ہے جس کی بنیادی صفت فکر ہے''(۴۷)

اس کو ایک مثال سے یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک جہاز کرش ہو جاتا ہے اور اس کے پائلٹ کا پورا جسم جل کر مردہ ہو جاتا ہے لیکن اس کا سر بچ جاتا ہے اگر ہم اس کے سر کو کسی ایسی مشین کے ساتھ جوڑ دیں جو اس کے دماغ میں تحریک پیدا کر سکے تو وہ سب کچھ بتا دے گا کہ جہاز کا حادثہ کس وجہ سے پیش آیا یعنی اپنی فکر میں وہ اب بھی زندہ ہے اگرچہ اس کا جسم باقی نہیں رہا۔ جب انسان کہتا ہے کہ میں نے دیکھا تو کون ہے جو کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ جسم کے علاوہ کچھ اور ہی ہے جس وقت انسان غور کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ سے مشورہ نہیں کرتا ہے، ظاہر ہے کوئی دوسری حقیقت ہے جس سے وہ مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جسم نہیں ہے جو رائے دیتا ہے کہ یہ کام کروں اور وہ نہ کروں، اس کے نقصانات کیا ہیں اور اس کے فائدے کیا ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کا ارادہ کرتا ہے مگر غور وفکر کرنے کے بعد اس کام کو چھوڑ دیتا ہے، اس کے علاوہ انسان سوتے میں دنیا کی سیر کر لیتا ہے۔ حالانکہ جسم اپنی جگہ پر ہے۔ یہ سیر کرنے والا کون ہے؟ یہ وہی ہے جو انسان کی ثانوی حقیقت ہے۔

ہائیڈیگر کی فکر کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں امکان (Possibility) واقعیت (Facticity اور ہبوطت (Fallen) شامل ہیں۔ اس کے خیال میں فکر ایک امکان ہے لہٰذا انسان آپ اپنا امکان ہے۔ اگر ہائیڈیگر کی یہ بات درست ہے تو پھر انسان کے تمام امکانات میں سے موت بھی ایک امکان ہے۔ اس طرح واقعیت سے اس کی مراد انسان کا اس دنیا میں ''پھینکے جانے'' کو بطور میراث قبول کرنا ہے۔ انسانی وجود ایک واقعہ ہے اور اس کا امکان اس کی اسی واقعیت سے وابستہ ہے۔ لہٰذا موت انسان کا کوئی اتفاقی امکان نہیں یہ ایک اٹل امکان ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ اسی طرح ہبوطت سے مراد انسان کے غیر شخصی زندگی گزارنے کے ہیں چونکہ وہ اس دنیا میں پھینک دیا گیا ہے اور اس نے اس کو اپنا مستقل گھر سمجھ لیا ہے اس طرح وہ اپنی موت کو بھول گیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک دن آنا ہے لیکن ابھی تک وہ خود اس سے دو چار نہیں ہوا لہٰذا اس کے بارے

میں سوچنے کی ضرورت نہیں یعنی یہ موت کا شخصی تصور ہے۔ داخلیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔(۲۸)

ژاں پال سارتر نے ہائیڈیگر کی اس بات سے اتفاق کیا کہ موت اور زندگی دونوں ہم مرتبہ ہیں۔ لیکن ہمیں نہ دنیا میں پھینکے جانے کا اختیار ہے اور نہ ہی یہاں سے اٹھائے جانے کا اگر وہ اس بات کو محسوس کرتا تو کبھی بھی موت کو انسان کا امکان نہ کہتا۔ سارتر کے نزدیک موت کا تعلق انسان کی داخلیت سے نہیں یہ سراسر ایک خارجی معاملہ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا کوئی مقررہ وقت نہیں، یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے البتہ اس کا آنا یقینی ہے لیکن کب آئے گی اس کا کسی کو علم نہیں یہاں تک سارتر کا تصور موت اسلام کے قریب تر ہے قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ان الله عنده علم الساعة و ينزل الغيث و يعلم ما في الارحام وما تدری نفس ماذا تكسب غدًا و ما تدری نفس بأیّ ارض تموت ان الله عليم خبير﴾(۲۹)

''اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی حاملہ کے پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے کہ نر یا مادہ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کام کرے گا اور متنفس نہیں جانتا کہ کس سر زمین میں اس کو موت آئیگی بیشک اللہ ہی جاننے والا اور خبردار ہے''۔

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ موت انسان کا امکان نہیں یہ ایک اٹل صورت حال ہے یہ خارج سے آتی ہے اور ہمیں خارج کی ایک چیز بنا دیتی ہے۔ ہم نہ تو اپنی خوشی سے اس دنیا میں آتے ہیں اور نہ ہی اپنی خوشی سے یہاں چلے جاتے ہیں اسی لئے ذوق نے کہا تھا کہ:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   نہ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

کرکیگارڈ کے نزدیک موت ایک ایسا امکان ہے جس سے انسان کی داخلیت پروان چڑھتی ہے اور اس کے جذبہ عمل کو فروغ ملتا ہے۔ اسلام وسیع معنوں میں پیغام عمل ہے ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿و ان لّیس للانسان الا ما سعٰی﴾(۳۰)

''انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے''

اسلام میں عمل پر جو زور دیا اس کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جہاں تک عمل پر زور کا تعلق ہے اسلام اور وجودیت میں یہ قدر مشترک ہے، البتہ وجودیت جذبات کا انتہا پسند فلسفہ ہے جبکہ اسلام عقل اور جذبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اسلام

اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن پاک موت کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جس پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ اسلام اور وجودیت میں جو دوسری بات مشترک ہے وہ یہ کہ بعض وجودیوں کے نزدیک موت ایک خارجی واقعہ ہے اور بعض کے نزدیک داخلیت کا لازمی جزبھی ہے۔ اسلام بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ موت ایک طرف خارجی واقعہ ہے جو مستقبل میں پیش آنے والا ہے تو دوسری طرف ایک سچے مسلمان کے لئے داخلیت کا لازمی جز بھی ہے جس پر اس کی روحانی ترقی کا دار و مدار ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جب مسلمان نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اس کو اپنی زندگی کی آخری نماز سمجھ کر پڑھے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ موت کو یاد رکھے اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کو نہ بھولے۔(۳۱) اسی طرح فرمایا کہ بہت یاد کرو لذتوں کو کھو دینے والی چیز یعنی موت کو یاد رکھو۔(۳۲)

موت کو یاد رکھنا سراسر داخلی کیفیت ہے۔ یہ ہماری داخلیت کا جزو بن کر ہمیں اچھے اعمال کی طرف راغب کرتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔ پس موت کا شعور ہمیں حقیقی زندگی عطا کرتا ہے جسے ہائیڈیگر کی زبان میں مصدقہ وجود کہا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس سے غفلت برتیں تو دنیا کی حرص اور آرزو میں کھو جاتے ہیں یعنی ایک غیر حقیقی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ ہائیڈیگر کی نزدیک یہ ایک غیر مصدقہ وجود ہے۔ حقیقی زندگی میں دنیا آخرت کی کھیتی ہے جب کہ غیر حقیقی زندگی میں وہ اپنا آپ ہی مقصود بن جاتی ہے لیکن جب انسان حرص دنیا و آرزو دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو اس کے سامنے ایک ہی بات ہوتی ہے کہ:

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

کسی بادشاہ نے ایک درویش سے کہا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگ لینا۔ درویش نے جواب دیا تو میرے غلاموں کا غلام ہے میں تجھ سے کیا مانگوں گا۔ بادشاہ بولا یہ کیا بات ہوئی درویش نے جواب دیا حریص دنیا اور آروز دنیا میرے غلام ہیں اور تمھارے آقا تم تو میرے غلاموں کے غلام ہو میں تم سے کیا مانگوں گا۔

موت کوئی ایسی شئے نہیں جو انسان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی لاتی ہے۔ جس طرح انسان نیند میں نفس کے حوالے سے مر جاتا ہے لیکن شعوری حوالے سے زندہ رہتا ہے یہی وجہ ہے خواب میں کہاں کہاں کی سیر کر لیتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات کا تبادلہ خیالات کرتا ہے۔ اسی طرح ظاہری موت کے بعد انسان شعوری طور پر زندہ رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے بیہوشی میں

انسان کے حواس کام نہیں کرتے مگر اس کا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے بھی موت کو بیہوشی سے تشبیہہ دی ہے ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿وجآء ت سکرة الموت بالحق ذٰلک ما کنت منه تحید﴾(۳۳)

''اور موت کی بیہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہو گی۔ اے انسان یہی وہ حالت ہے، جس سے تو بھاگتا تھا''

Antonio Rosmini اپنی کتاب "Essence of the soul'' میں لکھتا ہے کہ:

"What happens, then, at death? Simply the dissolution of the corporeal organism, and consequently the dissipation of organic- corporeal feeling. All that perishes is the organism and its relative feeling, nothing more. The body, however, which limits space is essentially different from the space that is limited; this space is altogather independent of the body. Space, therefore, cannot be taken from the soul simply because the soul has lost its bodily term. The rartional soul which has lost the body must, therefore, still retain two terms: 1. essential being which renders it intellective; 2. pure, unlimited space. It follows that with this second term it still maintains a certain relationship with the created universe whose extension it feels. But we have seen that the principle which feels unlimited space is the root of the corpreal sensitive principle. It is as it were the principle of the sensitive principle, the remote principle of feeling. Here we have already arrived at a very satisfying conclusion: the human soul separated from the body still preserves its radical potency for feeling." (۳۴)

جس طرح بچپن سے جوانی افضل ہے اسی طرح موت، حیات کا بلند درجہ ہے، جہاں زندگی

ارتقاء کی انتہائی منزل پر جا پہنچے گی۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿انظر کیف فضلنا بعضهم علیٰ بعض وللاٰخرة اکبر درجٰت و اکبر تفضیلا﴾(۳۵)

''دیکھو ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور آخرت درجوں میں دنیا سے بہت برتر اور برتری میں بڑھ کر ہے''۔

موت دراصل حیات کا ارتقاء ہے اور ارتقاء میں کوئی بھی شئے اپنی بنیادی ہیئت میں تبدیلی نہیں لاتی جس طرح پانی اپنی اصل ہیئت مائع سے ٹھوس حالت برف میں تبدیل ہوتا ہے یا بخارات کی شکل میں گیس میں تبدیل ہوتا ہے لیکن اس کے بنیادی اجزاء ترکیبی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تینوں حالتوں میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا تناسب یکساں رہتا ہے۔ دنیا میں ہی ہم دیکھتے ہیں حیا ت چرند پرند سے لے کر انسان اور انسانوں میں افضل انسان انبیاء کرام میں حیات رواں دواں ہے یہ زندگی کا ارتقاء ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿قالوآ إنا لله و إنا الیه راجعون﴾(۳٦)

''تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

یہ آیت زندگی کے ارتقاء کی ہی وضاحت کرتی ہے کہ انسان بتدریج آگے بڑھنے کی خواہش کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ عشق ہے۔ عشق میں کسی شئے کو پانے کی خواہش پوشیدہ ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی میں ارتقاء کی خواہش پوشیدہ ہے۔ فارسی کا ایک شعر اسی عشق کی ترجمانی کرتا ہے:

گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است
ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ
جنت است او اگرچہ باشد قعر چاہ
با تو دوزخ جنت است اے جانفرا
بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا تو نے سیاحت میں کون سا شہر پسند کیا؟ اس نے جواب دیا سب سے عمدہ شہر وہ ہے جہاں محبوب ہو۔ وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو۔ اے محبوب بے تمہارے جنت بھی دوزخ ہے اور تمہارے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں انسان کے ارتقاء کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰما فکسونا العظٰم لحما

ثم أنشانٰہ خلقا اخر فتبرٰک اللہ احسن الخالقین﴾(۳۷)

''پھر نطفے کا لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔ تو اللہ سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے''۔

زندگی کے شعوری ارتقاء کی طرف امام غزالی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس امارہ سے نفس لوامہ اور پھر نفس مطمئنہ کی طرف ترقی کرے۔ موت دراصل حیات کا ایک بلند تر درجہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿انظر کیف فضّلنا بعضھم علیٰ بعض وللاٰخرۃ اکبر درجٰت و اکبر تفضیلا﴾(۳۸)

''دیکھو ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور آخرت درجوں میں دنیا سے بہت برتر اور برتری میں کہیں بڑھ کر ہے''۔

اگر گندم یا کسی اور شئے کا دانہ زمین میں جا کر درخت بن کر نکلتا ہے تو کیا انسان زمین میں جا کر کچھ بھی نہیں بنے گا۔ جس طرح ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جہاز پانی کے اندر چلتا ہوا دور جا کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہی حال موت کا ہے جو ایک انسان کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے لیکن مٹا نہیں سکتی۔ غالب نے کیا خوب کہا کہ:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بارش سمندر کے پانی سے بخارات کی صورت میں آتی ہے۔ پانی کا قطرہ بارش سے گرتا ہے پھر ندی نالوں سے ہوتا ہوا واپس سمندر میں جا ملتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنا وجود کھونہیں دیتا بلکہ وہ سمندر کے وجود کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اسی ملاپ کا اصطلاحی نام موت ہے۔ دراصل یہی حقیقی زندگی ہے۔ جب بارش برستی ہے تو وہ زمین کو سرسبز اور شاداب بنا دیتی ہے۔ اسی طرح موت زمین پر پائے جانے والی حیات کے لئے بارش ہے جس سے زندگی مزید سرسبز اور شاداب ہو جاتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿واللہ الذی ارسل الرّیٰح فتثیر سحابا فسقنٰہ الیٰ بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتھا کذٰلک النشور﴾(۳۹)

''اور اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتے ہیں۔

اسی طر ح مردوں کو جی اٹھنا ہوگا''۔

اس آیت میں واضح اشارہ ملتا ہے جس طرح بارش سے مردہ زمین کو دوبارہ زندگی ملتی ہے اسی طرح موت نئی زندگی کے لئے بارش کا کام دیتی ہے۔ زمین بارش کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے نہ کہ بارش زمین کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اسی طرح زندگی موت کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے نہ کہ موت زندگی کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ زندگی کو کبھی بھی موت نہیں آتی البتہ موت کو خود موت ضرور آئے گی۔ نبی پاکﷺ نے فرمایا کہ:

''**وقال یؤتی بالموت کانه کبش فیذبح بین الجنة والنار**''

''فرمایا کہ موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی، پھر دوزخ اور بہشت کے درمیان ذبح کر دی جائے گی''

اللہ رب العزت فرمائے گا یہ ہے موت جس کو آج ذبح کر دیا گیا اب موت کبھی نہیں آئے گی۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿**یتجرّعه ولا یکاد یسیغه ویاتیه الموت من کل مکان وّما هو بمیت ومن ورآئه عذاب غلیظ**﴾(۴۰)

''وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور گلے سے نہیں اُتار سکے گا اور ہر طرف سے اُسے موت آ رہی ہو گی مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا اور اس کے پیچھے سخت عذاب ہوگا۔''

مولانا روم کے نزدیک قرآن پاک کی اس آیت ''کل شیءٍ هالك الا وجهه'' سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے فانی ہے تو انسان کو بقا کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ذات الٰہی سے باہر کوئی چیز نہیں رہ سکتی لیکن مقصود حیات اپنی انفرادی خواہشوں کو فنا کر کے اس کلیت میں ضم ہو جاتا ہے جسے وجہ اللہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ بقا کا راستہ اپنی پہلی منزل میں فنا کا راستہ ہے مگر اسی فنا میں بقا ہے۔ ہماری ہستیوں کے جو آنی جانی پہلو ہیں اور جو بے اصل خواہشیں ہیں وہ نور حقیقت کے مقابلے میں سائے کی طرح ہیں۔ ظہور نور کے بعد سایہ کہاں رہے گا؟ انسان نور میں داخل ہو سکتا ہے اور اس خلوت میں بقا ہی بقا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حیات و کائنات میں ایک اصول کارفرما ہے کہ عروج و ترقی کے لئے ادنیٰ وجود کسی برتر وجود سے ہمکنار ہوتا ہے۔ تمام موجودات میں ادنیٰ اور اعلیٰ درجے ہیں ان میں سب سے کم تر درجہ جمادات کا ہے اس کے اوپر نباتات، اس کے اوپر حیوانات، اس کے اوپر انسان پھر انسانوں میں بعض کے درجے دوسروں

سے بہتر ہیں۔ مثلاً انبیاء کرام کا درجہ عام انسانوں سے بہت بلند تر ہے۔ ادنیٰ درجے میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اعلیٰ کا ہم رنگ ہو جائے جس طرح لوہا آگ میں جا کر آگ کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے۔ روٹی ہضم ہو کر انسان کی جان اور شعور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سرمہ آنکھ میں پڑ کر بینائی بن جاتی ہے۔ تمام موجودات میں ترقی کی راہیں کشادہ ہیں۔ اپنی ذات کو کسی بالا تر ہستی میں ضم کر کے اس کا ہم صفت ہو جانا اسی طرح زندگی کو بقائے دوام حاصل ہو جائے گا۔ ہائیڈیگر کا یہ مابعد الطبیعیاتی جملہ کہ انسان ''وجود برائے فکر ہے'' اسلام کے تصور فکر کے قریب ترین ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿**قد علمنا ما تنقص الارض منهم و عند نا کتٰب حفیظ**﴾(۴۱)

''اُن کے جسموں کو زمین جتنا کھا کھا کر کم کرتی جاتی ہے ہم کو معلوم ہے اور ہمارے پاس تحریری یاداشت بھی ہے''۔

یہ تحریری یاداشت دراصل انسان کا شعوری فکر ہے۔ انسان اس دنیا میں جو اعمال سر انجام دیتا ہے وہ اس کے لا شعور میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے کئے ہوئے اعمال اکثر یاد آتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ کیوں کہ ہمارا لاشعور ہمارے ساتھ ساتھ ہوتا ہے شعور اور لاشعور کے درمیان تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے جب وہ شعور کی طرف عود کرتے ہیں تو ہمیں وہ سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری موت انسانی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں لاتی وہ جوں کا توں رہتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿**وکل انسان الزمنٰه طٓئِرَه‘ فی عنقه و نخرج له یوم القیمة کتبا یَّلْقٰهُ منشورا. اقرا کتٰبک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبا**﴾(۴۲)

''اور ہم نے انسان کے اعمال کو بصورت کتاب اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ کہا جائے گا اپنی کتاب پڑھ لے تو آج اپنا آپ ہی محاسبہ کافی ہے''۔

یہ کتاب دراصل ہمارا لاشعور ہی ہے جو ہمارے تمام اعمال کو ریکارڈ کیے جا رہا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

﴿**ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید**﴾(۴۳)

''کوئی بات اس کی زبان سے نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے''

یہ نگہبان انسان کا لاشعور ہی ہے جس نے تمام ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کیا ہوا اور اپنی اصل صورت میں موجود ہے۔ اس نے ہمارے اعمال کی پوری فلم تیار کر رکھی ہے جب اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلی چمکے گی تو ہر انسان کے اعمال کی فلم چل پڑے گی اور خود اپنے کئے ہوئے اعمال کو دیکھے گا۔ یہی زندگی کی روانی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ القرآن ۷:۲۴۔۲۵

۲۔ القرآن ۲:۱۹۵

۳۔ القرآن ۵:۳۲

۴۔ القرآن ۱۶:۶۱

۵۔ القرآن ۳:۱۴۵

۶۔ القرآن ۲۳:۱۲

۷۔ القرآن ۳۸:۷۱۔۷۲

۸۔ القرآن ۲۵:۵۸

۹۔ القرآن ۳۱:۳۴

۱۰۔ القرآن ۳۹:۴۲

۱۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (مرتبہ)، حجتہ اللہ البالغہ ایک تجزیاتی مطالعہ، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ انڈیا، ۲۰۰۲۔ ص ۱۲۲

۱۲۔ القرآن ۲:۱۵۴

۱۳۔ القرآن ۲۱:۳۵

۱۴۔ القرآن ۱۲:۵۳

۱۵۔ القرآن ۷۵:۱۔۲

۱۶۔ مسند احمد بن حنبل، رقم ۱۶۹۷۶

۱۷۔ القرآن ۸۹:۲۷۔۲۸

۱۸۔ القرآن ۶۷:۲

۱۹۔ القرآن ۳:۱۰۲

۲۰۔ القرآن ۱۰:۳

۲۱۔ القرآن ۳:۱۹۱

۲۲۔ القرآن ۱۶:۶۹
۲۳۔ القرآن ۲:۲۱۹
۲۴۔ القرآن ۵۹: ۱۲
۲۵۔ القرآن ۳۹:۴۲
۲۶۔ القرآن ۶:۷۶۔ ۸۰
۲۷۔ ڈاکٹر نعیم احمد تاریخ فلسفہ جدید، علمی کتب خانہ لاہور۔ سن ندارد، ص۔ ۱۶
۲۸۔ جاوید اقبال ندیم، وجودیت، علمی بک ہاؤس لاہور۔ ۱۹۸۹۔ ص۔۱۱۴۔۱۲۵
۲۹۔ القرآن ۳۱:۳۴
۳۰۔ القرآن ۵۳:۳۹
۳۱۔ مشکوۃ جلد اول ص۔۲۸۱
۳۲۔ ایضاً
۳۳۔ القرآن ۵۰:۱۹
۳۴۔ Antonio Rosmini,(1989) *Psychology,* Volume 1, translated by Denis Cleary and Terence Watson, Rosmini House, U.K,Pp. 335- 336
۳۵۔ القرآن ۱۷:۲۱
۳۶۔ القرآن ۲:۱۵۶
۳۷۔ القرآن ۲۳:۱۴
۳۸: القرآن ۱۷:۲۱
۳۹۔ القرآن ۳۵:۹
۴۰۔ القرآن ۱۴:۱۷
۴۱۔ القرآن ۵۰:۴
۴۲۔ القرآن ۱۷:۱۳۔۱۴
۴۳۔ القرآن ۵۰:۱۸

....